Research Journal
Tahqeeqat

ریسرچ جرنل
تحقیقات

eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334

سید مبارک شاہ کی نظم اور فلسفۂ جبر

Poems of Syed Mubarik Shah and Philosophy of Coercing

Dr. Majid Mushtaq
Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad
Dr. Muhammad Awais Saleemi
Assistant Controller of Examinations,
Govt. College University, Faisalabad
Ali Raza
M.Phil Urdu, Govt. College University, Faisalabad

ڈاکٹر ماجد مشتاق
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
ڈاکٹر محمد اویس سلیمی
اسسٹنٹ کنٹرولر امتحانات، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
علی رضا
ایم۔فل اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

Creation of mankind and as a best creation of Allah Almighty, having different approaches to know the universe and role of man in it. A though process is called 'Philosophy' as a tool of awareness about it. In particular Islamic philosophy having some basis of its believe. One of these facts is Destiny(Taqdeer). Towards this there are two major philosophies,one is coercing; means we are bound to act rather than authority. Urdu poets describe this approach in their poetry. A person feels that he or she cannot do anything (helpless) is a practical situation of this thought. This article shows some glympsis of this thought in thepoems of Syed Mubarik Shah. Syed Mubarik Shah is an important name of current era in poetry. Although this approach have along tradition in urdu poetry but Syed Mubarik Shah presented it in a different style. His poems did not follow the traditional situation; he presented it a situation of current age and human approach. This article will reflect the meaning and approach of coercin and in particular Syed Mubarik Shah's approach towards faith and destiny. Large number of people like this, the poet gives it a different narrative.

Keywords: *Coercion, Scholarly, Code of Conduct, Meer Taqi Meer, Creation of Mankind, Metaphysical Situations, Emotional*

کلیدی الفاظ: جبر، دانشوارانہ، ضابطۂ اخلاق، میر تقی میر، تخلیقِ آدمؑ، ماورائی صورتیں، جذباتی

ادب زندگی کا ترجمان اور آئینہ دار ہے۔ ادیب اور شاعر جہاں اندرونی و باطنی کیفیات کا اظہار کرتا ہے، اپنے عہد، سماج اور فکر و فلسفہ سے مطابقت کو بھی موضوع بناتا ہے۔ شاعر جس معاشرے میں سانس لیتا ہے وہاں کا نظامِ زندگی کسی طور اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ نظریاتی اور فکری سطح پر ایسے معاشرے جو مذہب کی بنیاد پر استوار ہوا کرتے ہیں وہاں شاعر کے لیے کئی ایک پابندیاں اس کی قوتِ متخیلہ کو جکڑے ہوئے نظر آتی ہیں۔ اُردو ادب کی ترجمانی میں پیش پیش سرزمینِ پاکستان بھی نظریاتی فکری بنیاد پر قائم کردہ معاشرے کی مثال ہے۔ اس خطہ سے وابستہ شعرا و ادبا کے ہاں ایسے موضوعات کی تعداد کم نہیں جو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مذہب کی فکری اساس اور عملی صورتِ حال کے عکاس ہیں۔ بعض دانش ور تو اسے ایک پابندی خیال کرتے ہوئے محض مقتدر رائے سے زیادہ کچھ خیال نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے نزدیک مذہب اور فلسفہ باہم متضاد و متصادم ہیں۔ حقیقت دراصل مختلف ہے۔ انسانی تاریخ کا اربوں سالوں کا سفر مختلف فلسفہ ہائے زندگی کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ انھی فلسفہ ہائے زندگی میں سے ایک مذہب ہے۔

کسی بھی فلسفہ کے مصداق اس کی بنیاد بھی کسی ایک نکتہ پر مرکوز ہے اور اسی نکتہ سے استنباط کرتے ہوئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتا ہے۔ ہمارے ہاں عمومی رویہ ہے کہ دانش ور حضرات نے مذہب کی فکری اساس کو موضوع بنانے کی بجائے اس پر عمل پیرا افراد کے عملی پہلوؤں کی خرابیوں اور کجیوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ مذہب کی فکری اساس بھی مختلف جہات کو موضوع بناتی ہے۔ اس جہات کو

عقیدہ، ایمان کچھ بھی نام دے لیجیے اس کی حیثیت اس ضابطۂ اخلاق کی ہے جو زندگی گزارتے ہوئے راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات بنیادی ایمانیات کے گرد گھومتی ہیں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسانی فکری نظام کو ایک سمت دینے کے لیے یہ راہنما اصول ہیں اور یہ اُصول بنیادی ایمانیات کہلاتے ہیں:

"نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے مونہوں کو موڑ لو مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، تقدیر کے اچھا برا ہونے پر، مرنے پر اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔"(۱)

ان ایمانیات میں سے ایک تقدیر ہے۔ تقدیر سے مراد وہ احکامات یا فیصلے ہیں جو انسان کی تخلیق سے پہلے سے طے ہیں اور انسان وہی کچھ کرتا ہے جو لوحِ محفوظ میں لکھ دیا گیا۔ اس تصور کو تمام تر اعمال و افعال پہلے سے لکھے ہوئے ہیں پر مختلف دانش وروں نے غور و فکر کے بعد اپنے اپنے انداز میں سمجھا اور پیش کیا ہے۔ تقدیر اور تصورِ تقدیر کے حوالے سے دو معروف فلسفہ ہائے فکر موجود ہیں۔ فلسفۂ جبر اور فلسفۂ قدر۔

فلسفۂ جبر سے مراد ہے کہ انسان اپنے اعمال پر قادر نہیں بلکہ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو پہلے سے لکھا ہے اور اس میں اس کی رائے اور سوچ کا دخل نہیں۔ وہ مجبورِ محض ہے۔ اس فلسفۂ جبر کے ماننے والوں کے ہاں یہ خیال موجود ہے کہ انسانی اعمال محض لکھی ہوئی کہانی میں متعینہ کردار کی صورت ہیں اور انسان کا کردار بس ایک پروگرام کی صورت چلتا ہے۔ وہ اس نظریے کی حمایت میں یہ آیتِ کریمہ پیش کرتے ہیں:

"بے شک اللہ ہی ہے جو ہر شے پر قادر ہے۔"(۲)

اس فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کچھ اس طرح سوال اٹھایا ہے:

"اگر انسان پابند یا مجبور ہے تو اعمال کی ذمہ داری و جواب دہی اور ہر مدح و ذم یا جزا و سزا کے استحقاق کا قاعدہ جس پر ہمارے اخلاقی تصورات مبنی ہیں اور جو ہمارے نظامِ اجتماعی کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے، کس اساس پر قائم ہو گا۔"(۳)

یہی سوال ہے جس نے انسانی اخلاقیات کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی۔ یہی سوال اس فلسفہ کے مخالف ایک فکر کی بنیاد ہے جو فلسفۂ قدر کی علم بردار ہے۔ اُن کے نزدیک پہلے سے لکھے ہوئے کا مطلب مجبوری نہیں بلکہ انسان اپنے اعمال پر قادر ہے۔ نظامِ قدرت میں لکھی تقدیر کہیں بھی واضح اور نمایاں نہیں بلکہ اللہ عزوجل نے اسے ایک پوشیدہ اور سربستہ راز کی صورت رکھا ہے۔ انسان اپنی کوشش اور سعی پر قادر ہے اور پھر فیصلہ اسی سعی کے مطابق قدرت کرتی ہے۔ ان کے نزدیک تقدیر کو موردِ الزام ٹھہرا کر عمل سے فرار حاصل نہیں کیا جا سکتا، وہ اس حوالے سے یہ آیت پیش کرتے ہیں: "انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔"(۴)

یہاں دونوں فکری ضابطوں کا نہ تو موازنہ مقصود ہے اور نہ ہی تقابل بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان تقدیر کے حوالے سے کس طرح سوچتا آیا ہے اور کس طرح سے اُسے سمجھتا اور پرکھتا ہے۔ اردو شاعری میں فلسفۂ جبر کی عکاسی کی مثالیں کلاسیکی شعرا سے ہی چلی آ رہی ہیں بالخصوص غزل میں یاسیت کا شکار شاعر اپنے موضوعات میں تقدیر کو موردِ الزام ٹھہراتے دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفۂ جبر کی عکاسی کے حوالے سے میر تقی میر کا یہ شعر زبان زدِ عام ہے اور انسانی مجبوریوں کا بہترین عکاس دکھائی دیتا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا(۵)

اسی طرح شعری تاریخ میں شعرا نے الگ الگ اسلوب میں اسی فلسفہ کو بیان کیا ہے۔ اسے اپنے دنیاوی معمولات سے تعبیر کر کے اظہار کیا گیا تو کہیں حسیاتی سطح پر اسے موضوع بنایا گیا:

امیرِ شہر نے کاغذ کی کشتیاں دے کر
سمندروں کے سفر پہ کیا روانہ ہمیں(۶)

سید مبارک شاہ عہدِ جدید کے منفرد لب ولہجہ کے شاعر ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں یکساں مہارت رکھنے والا یہ شاعر یکم جنوری ۱۹۶۱ء کو چکوال میں پیدا ہوئے۔(۷) پیشہ کے اعتبار سے سول سروسز سے منسلک رہے اور ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء، راولپنڈی میں وفات پائی۔(۸) شعر و سخن سے وابستگی ان کا طبعی میلان نظر آتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے "جنگل گمان کے"، "ہم اپنی ذات کے کافر"، "مدار نارسائی میں" زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔ بعد از مرگ ان کے غیر مطبوعہ کلام کو شامل کر کے ان کا کلیات مرتب کیا گیا۔ جس کی ترتیب و تزئین سلمان ناصر اور گل شیر بٹ نے سر انجام دی۔

سید مبارک شاہ اپنے عہد کے عمومی رجحانات سے الگ روش اپنا کر ایک منفرد شاعر کی صورت سامنے آتے ہیں۔ ان کے اشعار سیاسی، سماجی، نظر حوالوں کو الگ معانی پہناتے ہیں اور اُن کے موضوعات میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ کاٹ دار انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظموں میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ تقدیر کے فلسفۂ جبر کی عکاسی بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ ان کا یہ اظہاریہ ذاتی یا باطنی احساسات کا ہی عکاس نہیں بلکہ حالات کی ستم ظریفیوں کے شکار ہزاروں لاکھوں انسانوں کی ترجمانی ہے جو مایوسی میں گھِرے اس طرح کے جذبات کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا موضوع جو جابجا دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے مگر ان جذبات کا اظہار محدود اور ملفوف انداز کا مظہر ہے۔ سید مبارک علی شاہ کی نظم "تمثیل" فلسفۂ جبر کی خوب صورت عکاسی ہے:

مصنف ہے
کہانی اُس نے لکھی ہے
سبھی کردار اُس کے ہیں
کوئی مجرم، کوئی ملزم، کوئی معصوم ہے لیکن
سبھی انداز اُس کے ہیں
پسِ منظر وہ پوشیدہ سہی پھر بھی
سرِ منظر تو سب غماز اُس کے ہیں
ہدایت کار بھی خود ہے
یہاں اُس کے اشاروں پر
اداکاروں نے کرداروں کو اتنی جانفشانی سے نبھایا ہے
کہ اِک لکھی کہانی کو حقیقت کر دکھایا ہے
مگر اس داستاں کا آخری منظر قیامت ہے
قیامت ہے!
کہانی کا مصنف
اپنی اُجرت مانگنے والے کرداروں سے کہتا ہے

صلہ دوں گا مگر تم کو
میں کرداروں کے کرموں کا صلہ دوں گا
میں منصف ہوں، مگر اپنی رضا سے فیصلہ دوں گا
کہانی ختم ہونے پر
انھیں اذنِ تکلم تو نہیں لیکن
اداکاروں کو بس اتنی شکایت ہے
کہ منصف تو مصنف تھا
کہانی اُس نے لکھی تھی
سبھی کردار اُس کے تھے(۹)

فلسفۂ جبر کے تناظر میں سید مبارک شاہ کی یہ نظم ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے تخلیقِ آدمؑ سے فنا کے سفر کو اس روانی سے پیش کیا ہے کہ تمام زندگی اس میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ انسان سٹیج کے اداکار کی صورت اپنے لکھے ہوئے کردار کو جاندار بنانے کی سعی کرتا ہے تو اُسے فطری طور پر ستائش اور صلے کی تمنا ہوتی ہے یا یوں کہیے کہ اسے فطری طور پر یہ جذبہ عطا ہوا ہے مگر یہاں وہ اس اسٹیج پر اداکاری کر رہا ہے جس کا مصنف خود ہی منصف ہے۔ اس پر صاحبانِ علم جو بھی فتویٰ لگائیں مگر علم کی ظاہری صورت تو ارادہ 'کُن' اور 'فیکون' کی صورت ایک خواہش پر مرتکز ہے اور پھر اس خواہش کی تکمیل پر منصف کا کردار بدل جاتا ہے اور مصنف کی صورت اختیار کر لے گا جہاں عدل کی اہمیت بھی واضح کی گئی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی منشا کا دخل زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ کائنات کے اس پہلو سے نبرد آزما انسان بلاشبہ اس طرح کی کیفیات کا شکار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کی شعری تمثیلوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی کتاب ''معنی اور تناظر'' میں برگساں کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''شاعر وہ ہے جس کے ہاں محسوسات اور بصری تمثیلوں میں ڈھلیں اور بصری تمثیلیں لفظوں میں منتقل ہوں اور الفاظ، آہنگ کے قوانین کے تابع ہو کر ان کو کنکریٹ کی صورت عطا کر دیں۔''(۱۰)

سید مبارک شاہ کی نظموں میں جبر کی مختلف صورتیں اُجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہیں وہ محض مذہبی حوالے سے ہی اسے موضوع نہیں بناتے بلکہ اس کی عملی صورت بھی پیشِ نظر رہتی ہے۔ انسان کی نفسیات ہے کہ وہ منزل کے حصول کے لیے کوشاں رہتا ہے مگر یہ سفر لاحاصلی کی مثال بن کر نئے سفر کا عندیہ دیتا ہے اور اس شعر کے مصداق ہمیشہ برسرِ عمل اور مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ ندا اشرف اشرفی نے اسی کیفیت کو فارسی شعر میں یوں بیان کیا ہے:

بیا جاناں تماشا کُن کہ در انبوہِ جانبازاں
بہ صد سامانِ رسوائی ، سرِ بازار می رقصم(۱۱)

(ترجمہ: اے محبوب! آ دیکھ کہ جانبازوں کے اس ہجوم میں بصد رسوائی رقص کر رہا ہوں۔)

ان کی نظم ''پڑاؤ'' بھی اسی طرح کی حالت کا ادراک ہے، جہاں سفر مسلسل، جبر مسلسل کی صورت نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

انھیں تو ان گنت نوری زمانوں کی

مسافت سے گزر کر
چند لمحوں کے لیے شہر بدن میں سانس لینا تھا
تھکاوٹ دور کرنا تھی
اسی شہر بدن کے ایک کُوچے میں
نہ جانے کتنی مدت سے حریمِ دل مقفل ہے
کہ جس کے ایک گوشے میں
مقیمِ لامکاں ہے معتکف جس سے
انھیں آئندہ رستوں کا نشاں معلوم کرنا تھا
مگر اپنے وجودِ بے طلب کے بوجھ سے بوجھل
نوردِ عمر پھرتے ہیں کچھ ایسے دربدر ہو کر
کہ کاخِ خاکِ ہستی میں بھٹک کر بھی
حریمِ دل کے دروازوں پہ دستک دے نہیں سکتے
گرفتارِ شمارِ روز و شب ہو کر
مسافر بھول بیٹھے ہیں
نہ جانے کتنے نادیدہ جہانوں کا سفر درپیش ہے ان کو
حدودِ وقت سے آگے
انھی کا منتظر کب سے کھڑا ہے منتظر اُن کا
کہ رستوں کی رسائی سے بھی آگے ہے سفر اُن کا(۱۲)

حدودِ وقت سے مسلسل برسرِ پیکار جذبے اور لاحاصلی کی ازلی حقیقت درپیش ہو تو شاد ان تمام زمانوں کی دھول کو بھی جذبات و احساسات کے چہروں پر جمی تھی کسی بے کار مشقت کی طرح دیکھتا ہے۔ اس سارے سفر کا حاصل مزید سفر ہے۔ اسی سفر کی کیفیت کو وہ اپنی ایک اور نظم "اے مرے ہم سفر" میں ساتھ چلنے کی خواہش کے تناظر میں پیش کرتے ہیں:

اے مرے ہم سفر
ہم کو درپیش ہے
دائروں کا سفر
تجھ کو معلوم ہے
ختم ہوتا نہیں
چل مرے ساتھ چل
دو قدم ہی سہی

پھر عدم ہی سہی
اس سے پہلے مگر اِک قدم گرد خیز
گرد! جس کو کہیں
تیرے میرے سفر کا کمالِ سفر
سست رو رہ رووں کا مآلِ سفر (۱۳)

سید مبارک ہی شاہ کی نظموں میں فلسفۂ جبر کی مختلف صورتیں جاگزیں ہوتی ہیں۔ وہ محض خیال دُنیا میں رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ اس زندگی کے عملی پہلوؤں کو بغور پرکھتے اوراس کے انجام سے نتائج اخذ کرتے ہوئے اسے نظم کا روپ دیتے ہیں۔ انھیں دنیا کے قاعدوں، ضابطوں، مذہبی فلسفوں، انسانوں کے بدلتے معیارات اور اس سے متاثر انسان کی کیفیات سے دل چسپی ہے۔ اس شوق میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ اس کے انجام سے بے نیاز اپنی بات کہنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ یہ باتیں محض باتیں یا فردِ واحد کا احساس نہیں بلکہ وہ سوالات ہیں جو کائنات کی مادی اور ماورائی صورتوں کی تفہیم میں تاحال تشنہ حال ہیں۔ ان کے نزدیک معیارات کی تفہیم جن پیمانوں پر ہونی چاہیے، نہیں ہے یہاں نشیب و فراز کے معانی بدلتے ہیں، یہاں ایذا کا مفہوم ساکت و جامد ہے اور جانداروں کا عکاس نہیں، یہاں کے معیارات پر چوٹ کرتے ہوئے وہ اپنی نظم ''وہ منصف تھا'' میں کہتے ہیں:

وہ منصف تھا
مگر اس کی نگاہوں کا
بلندی پر ہی مسکن تھا
سو جب اُس نے ترازو میں
مجھے اور دوسری جانب
زمانے بھر کو رکھا تھا
مرا پلڑا جھکا تیزی سے نیچے کو
وہ منصف تھا
مگر اُس کی نگاہوں کا
بلندی پر ہی مسکن تھا (۱۴)

سید مبارک شاہ کا تصورِ جبر محض لکھی ہوئی تقدیر کے جبر تک محدود نہیں بلکہ اشرف المخلوقات انسان کے قائم کردہ نظام میں انسانی خواہشات وجذبات کا قتل، طاقتور کی مرضی کے معیارات، دوسروں کی قسمت میں نامرادی وناکامی کی تحریریں لکھتے قلم، اس جبر کی وہ صورتیں ہیں جو اس خاک پر اور جہانِ آب و گِل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے نزدیک جبر کسی ماورائی جہان تک محدود نہیں بلکہ نظامِ زندگی میں طاقت کے بل بوتے پر صورتیں بدل بدل کر کارفرما دکھائی دیتا ہے اور اس صورتِ حال میں ''خدائے لم یزل'' کا وجود بھی ان ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ اکائی سے ٹکڑوں میں بٹتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک معبودِ حقیقی کے ازلی و ابدی واحد و یکتا تصور کو متزلزل نہیں کیا جاسکتا مگر جب انسان ان حادثوں کا شکار ہوتا ہے تو اُسے اپنے تصورِ خدا پر چوٹ پڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایمان کا تنزل، اُسے تذبذب کا شکار کرتا ہے تو جبر کی یہ صورت جس میں

امکان کی روشنی کا دخل نہیں، ایک حادثے کی صورت لاحق ہوتا ہے۔ ایسے حوادث کے تواتر سے وجود تو لڑ لیتا ہے مگر جذبۂ ایمانی کب متزلزل ہو جائے دراصل یہی حادثہ ہے جسے سید مبارک شاہ نے اپنی نظم "حادثہ" میں حالات کے جبر کی صورت پیش کرتے ہوئے نظم کے آخر میں اس طرح اظہار کیا ہے:

مگر دعاؤں کے مُدّعا سے
خدا خداؤں میں بٹ گیا ہے
یہی حوادث کا حادثہ ہے
بدن اکائی کا کٹ گیا ہے(۱۵)

یہ کائنات اس طرح حادثوں سے دوچار ہے۔ انسان جو اپنے علم اور تفکر کی وجہ سے معراجِ تخلیق پر سرفراز تھا اُسے یہ گمان تھا کہ خالق اور مخلوقات کے درمیان اس کا مقام واضح اور متعین ہے اور اُسے خالق کی خواہش کی صورت یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دیگر مخلوقات سے افضل ہوتے ہوئے اُس ذات کو بھی اپنے علم کے بل بوتے پر تصور کی دسترس میں لا سکتا ہے۔ یعنی خالق اور مخلوق کے ربط کو تعلق کی صورت سمجھ کر دسترس میں لا سکتا ہے۔ اُسے اس گمان پر لانے والا بھی اُس کا خالق ہے جو کروڑوں سالوں کی مظہر مخلوق کو مجبور کرتا ہے کہ اُس کی خواہش کی تکمیل اُس آدم کو سجدہ کرے، جو اُس کے سامنے وجود میں لایا گیا اور پھر اُسے سامنے لا کر اُس کی برتری بھی اِسی علم سے ثابت کر دی گئی۔ وہ اشرف المخلوقات اس واہمے میں مبتلا اپنی دسترس کی وسعت کے گمان میں آگے بڑھتا ہے، ہر ممکن حد تک اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور پھر یہ کوشش خالی ہاتھوں کی صورت اُس کا مُنہ چڑاتی ہے تو مبارک شاہ اپنی نظم "دسترس" میں اس کا اظہار کرتے ہیں:

وہ میرے ہاتھوں کی دسترس سے
بہت پرے تھا
میں جھک گیا تھا
مگر وہ پھر بھی نشیب میں تھا
اُسے اٹھانے کے واسطے میں
اگرچہ اُترا تھا پستیوں میں
مگر وہ میری اَنا کے زینے پہ پاؤں رکھ کے
کچھ ایسا اُونچا ہوا کہ دیکھو
وہ میرے ہاتھوں کی دسترس میں نہیں رہا ہے(۱۶)

سید مبارک شاہ کی نظمیں فکری سطح پر فلسفۂ جبر کی مختلف صورتوں کی عکاس ہیں۔ اُن کے ہاں کائنات کا سفر بھی اسی جبر کا مظہر ہے تو نظامِ کائنات میں مسلسل اور رواں سلسلے بھی لاحاصل کی صورت اسی کا مظہر دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے پاس علامتوں کی وسیع کائنات موجود ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کے مختلف حوالوں کی تفہیم کی نئی صورت دے کر بیانیے میں دلآویزی پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا شعری سفر غیر متزلزل انداز میں فلسفیانہ و عملی سطح پر اِسے نبھاتا نظر آتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "جنگل گمان کے" کی نظمیں "نارسائی"، "اے میرے ہم سفر"، "تہی دامنی"، "وہ منصف تھا"، "وحشت" کے عنوانات اِسی فلسفے کی مختلف صورتوں کی مظہر ہیں۔ یہ سلسلہ ان کی دوسری کتاب "ہم اپنی

ذات کے کافر"میں جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔اس مجموعے میں شامل نظمیں "پڑاؤ"، "ابتلا"، "اندھیرا"، "مفر کی بات مت کرنا"، "ہم اپنی ذات کے کافر"، "ایک لرزیدہ دُعا"، "انحراف" اور "تمثیل" اس سلسلے کو آگے بڑھاتی نظر آتی ہیں۔ان کے تیسرے شعری مجموعے کی نظموں "کوہِ ندا"، "ایک لا وجود نظم"، "بنامِ خدا"، "امکان"، "تماشا" اور "مدارِ نارسائی" میں بھی فکر و فلسفہ کی اُپج فلسفۂ جبر کی مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔

یہ تسلسل اس بات کا مظہر ہے کہ ان کا یہ رویہ اور شاعرانہ تصور محض وقتی یا جذباتی تعلق کی سطح پر بنتا اور بکھرتا نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات تار و پو تخیل سے حقیقت تک وسیع کرتے ہوئے اُسے اپنے اندر اُتارتے ہیں اور پھر اِسے دل کی تپش سے ایک نئی صورت میں پختہ بنا کر پیش کرتے ہیں جس میں انسانی کیفیات، احساسات، جذبات کا اظہار بھی ہے اور اس پر عائد بندشوں کی خلقی اور ارضی صورتوں کی عکاسی بھی ہے۔ وہ انسانی مجبوریوں کی حقیقت سے واقف ہیں، وہ انسان کے خمیر میں ان مجبوریوں کی موجودگی کا ادراک رکھتے ہیں اور زمین پر بطور اشرف المخلوقات آزادی کی بجائے حدود و قیود کا مکمل اور واضح نقشہ رکھتے ہیں۔ان کے اظہاریے میں یہ مجبوری محض رونے دھونے کا عمل نہیں بلکہ پسپائی کی وہ صورت ہے جو ظاہر سے کہیں پرے اُس کی طرف منڈلاتی ہوئی آتی ہے۔

اس جبر کی عکاسی کا یہ پُر درد اظہار اُن کی مختصر نظم "ایک سرطان زدہ بچے کا سوال" میں نظر آتا ہے:

میرے سہمے ہوئے دل کی دھڑکن
کے سینے کے اندر دھڑکتی ہوئی
زندہ رہنے کی خواہش کے خالق خدا
مجھ کو سچ سچ بتادے کہ
مِری رگِ جاں میں یہ مرگ بردوش خوں
کس کی تخلیق ہے
جس نے میری سبھی آرزوؤں کا خوں کر دیا(۱۷)

انسانی کرب کی انتہا اور انسانی بے بسی کی مجسم تصویر، اس نظم کا وہ خاصا ہے جو قوتِ مشاہدہ سے دل میں سرایت کرتی ہے، یہاں ان کا اسلوب فلسفیانہ نہیں بلکہ جذباتی منظر کی صورت نظر آتا ہے۔ایسے کتنے ہی لمحے، کتنی ہی گھڑیاں، کتنے پڑاؤ عام انسان کی زندگی میں آتے ہیں جہاں غیب کے انعامات بے معانی ہو کر، اُس کی حدود کو ظاہر کرتی ہیں۔ایسی بے بسی کسی ظالم و جابر آقا کے حکم سے پرے ایک لکھے ہوئے اسکرپٹ کی صورت جاگزیں ہوتی ہے جس کا انکار اور اس سے مفر کسی صورت ممکن نہیں۔شاعر کا کمال ہے کہ وہ اس سارے فلسفے کی ممکنہ صورتوں کا اظہار بھی کرتا ہے مگر کہیں بھی فیصلہ سناتا نظر نہیں آتا، اس کا استفسار ہی اس کی خوبی ہے۔روزِ اول سے انسانی جبلت میں جاننے کی خواہش کا عمل دخل شاعر کا اسلوب بن کر اُس کی نظم کو چار چاند لگا دیتا ہے۔اس استفسار کا دائرہ محض انفرادی زندگی یا اس کے مسائل نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر اس زمین کا وجود، کائنات کا دائرہ کار، بگڑتی بنتی اخلاقی کہکشاں سب اُس کی زد میں ہیں۔وہ اپنے شعور اور قوتِ متخیلہ کے زور سے ایک فیصلے تک پہنچتا دکھائی دیتا ہے لیکن حتمی فیصلے کا داعی نہیں، اُسے اپنے مجبورِ محض ہونے کا احساس ہے اسی لیے وہ اپنے خالق سے استفسار کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ جن پہلوؤں کو میری دسترس میں دیا ہے اس سے پرے کیا ہے یا پھر فیصلہ دے کہ میں منزل پر پہنچ گیا ہوں۔اس ساری کیفیت میں ایک ناتمام سفر کی بازگشت ہے، دائرہ مکمل ہونے کو ہے مگر ایک وہم، ایک گمان، ایک نارسائی، کبھی جنگل، کبھی مدار بن کے حائل ہے۔ان کی

نظم ”ایک سوال“ ایک طرف ان کے استفساریہ اُسلوب کی عکاس ہے تو دوسری طرف اُس ساری کاوش اور سعی کا حاصل جو اپنے وجود، کائنات اور اس مادی زندگی کو سمجھنے کی ہے، کا مظہر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عمر کی مُہلت دینے والے
وقت کی یہ تقسیم ہے اپنی دُنیا کا مقسوم
کہ جس میں شام و سحر معدوم ہیں جیسے
گردش سے محروم
خلا میں پرتوں کے بل پل پل گرتا
دھرتی چپٹا تھال
چنانچہ دن کا ایسا حال کہ اس میں
آٹھ پہر کی دھوپ
کڑکتی دھوپ جو بدلے روپ تو جیسے
رات یکایک رات کہ جس میں
خواب سے کم تر نیند کا عرصہ
نیند سے لمبی رات کٹے تو
جلتی بجھتی آنکھ کے آتش دان میں پھر سے سورج کا چنگار
عمر کی مہلت دینے والے تجھ سے ایک سوال
ایک اندھیری نگری دُنیا یا جلتا سنسار[۱۸]

سید مبارک شاہ کی نظمیں زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی فکر و فلسفہ میں زندگی کے پنہاں راز رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظموں کا محبوب موضوع ذات اور احساسِ ذات کے شعور میں وجود کی تلاش اور اس وجود کے مقاصد کے حصول میں انسانی تگ و دو کی صورتیں شامل ہیں۔ انسانی تگ و دو کا یہ سفر لا محدود ہے جہاں قدم قدم پر نئے راز، سوال کی صورت اُس کے پاؤں پکڑتے ہیں، وہ ان رازوں سے پردہ اٹھانے کے لیے عازمِ سفر ہونا چاہتا ہے تو جبر کی تمام کار فرمائی اُس کے لیے سدِ راہ ہے۔ وہ اپنا کردار نبھا کر بھی منصف کی رضا کا محتاج ہے، اس کے سامنے پیمانِ زندگی اپنے پہلو بدل کر اُس کی قسمت میں نارسائی لکھتا ہے تو اُسے جبر کی کار فرمائی ہر سُو دکھائی دیتی ہے۔ سید مبارک شاہ کی نظموں میں فلسفۂ جبر کی مختلف صورتیں جلوہ گر ہیں جو شعری روایت کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک معنی خیز انفرادیت رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں کا یہ پہلو انھیں منفرد اور معتبر نظم گو کی صورت سامنے لاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

۱۔ البقرہ:۱۷۷
۲۔ آلِ عمران:۱۶۵
۳۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، مسئلۂ جبر و قدر، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء

۴۔ النجم:۳۹
۵۔ میر تقی میر، کلیاتِ میر، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۸ء، ص:۱۱
۶۔ محسن احسان، ناتمام، کراچی: ادارہ علم و فن، ۱۹۸۱ء، ص:۶۶
۷۔ سلطان ناصر، گل شیر بٹ، مرتبین: کلیاتِ سید مبارک شاہ، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۱ء، ص:۷
۸۔ ایضاً، ص:۸
۹۔ ایضاً، ص:۲۰۸۔۲۰۹
۱۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۴ء، ص:۷
۱۱۔ قندِ فارسی (گلدستۂ فاضل)، شمارہ نمبر ۲۔۳، جلد نمبر ۱۳۷، دہلی: سفارت خانہ جمہوری اسلامی ایران، ۱۹۹۱ء، ص:۱۶۰
۱۲۔ سلطان ناصر، گل شیر بٹ، مرتبین: کلیاتِ سید مبارک شاہ، ص:۲۱۸۔۲۱۹
۱۳۔ ایضاً، ص:۷۲
۱۴۔ ایضاً، ص:۸۶
۱۵۔ ایضاً، ص:۵۸۹
۱۶۔ ایضاً، ص:۸۷
۱۷۔ ایضاً، ص:۱۶۶
۱۸۔ ایضاً، ص:۳۵۲

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havashi-o-Havalajat

1. Al-Baqara:177
2. Aal Imran:165
3. Modoodi, Abu-al-Aala,Syed,Masla-e-Jabar-o-Qadr,Lahore:Islamic Publications, 1974
4. Al-Najam:39
5. Meer Taqi Meer, Kuliyaat-e-Meer,Lahore:Majlis-e-Taraqqi-e-Adab,1988,P11
6. Mohsin Ehsan,Natamaam,Karachi:Idara Ilm-o-Fann,1981,P 66
7. Sultan Nasir,Gul Sher Butt, Murattabeen:Kuliyaat-e-Syed Mubarik Shah,Jehlum: Book Corner,2021,P 7
8. Ibid,P 8
9. Ibid,P:208-209
10. Wazir Agha,Dr.,Maani-o-Tanazur,Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab,2004,P 7
11. Qand-e-Farsi(Guldasta-e-Faazil),Shumara No.2-3,Jild No.137,Delhi:Safarat Khana Jamhoori Islami Iran,1991,P 160
12. Sultan Nasir,Gul Sher Butt, Murattabeen:Kuliyaat-e-Syed Mubarik Shah, P 218-219
13. Ibid,P 72
14. Ibid,P 86

15. Ibid,P 589
16. Ibid,P 87
17. Ibid,P 166
18. Ibid,P 352